تین اوصاف

خدا کی جنت نفیس لوگوں کے رہنے کی نفیس جگہ ہے۔ یہ نفیس لوگ کیا ہیں اور ان کی سیرت و کردار کیا ہے، اس کو دیکھنا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیا کی اعلیٰ شخصیت میں دیکھ لیجیے اور پڑھنا ہے ہو تو قرآن مجید کے ان مقامات میں پڑھ لیجیے جن کو ہم نے اپنی کتاب قرآن کا مطلوب انسان میں بیان کیا ہے۔

یہ کردار تین بنیادی اوصاف سے پھوٹتا ہے۔ پہلا وصف صداقت ہے۔ صداقت جسے جدید نفسیات میں Authenticity کہا جاتا ہے، انسانی کردار کا وہ پہلو ہے جس میں سچ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ پھر جس سچ کو وہ مانتا ہے، قول و فعل سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ جو مقصد اختیار کرتا ہے اس کے مطابق اپنی شخصیت کو ڈھالتا چلا جاتا ہے۔

دوسرا وصف شہادت ہے۔ یعنی جس سچ کو پایا ہے اس کی گواہی دوسروں پر دے۔ جس خیر کو خود پایا ہے اسے دوسروں تک پہنچائے اور جس چیز کو شر جانا ہے، اس کی برائی سے دوسروں کو بچنے کی تلقین کرے۔

تیسرا وصف صالحیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی شخصیت ان اعمال کا منبع بن جائے جو سماج کو خیر اور بھلائی سے بھر دیں۔ انسان ان اعمال سے رک جائے جو زمین میں فساد برپا کرنے والے ہوں۔

یہ تینوں اوصاف اس کردار میں بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ تاہم انسانی ذوق کے لحاظ سے کچھ لوگوں میں پہلا، کچھ میں دوسرا اور کچھ میں تیسرا وصف غالب ہوتا ہے۔ اسی لیے روز قیامت کچھ لوگ صدیق، کچھ شہید اور کچھ صالح کہلائے جائیں گے۔ تاہم انسان پر لازم ہے کہ ان تینوں اوصاف کو خود میں پیدا کرے۔ ان میں ایک میں کمی اسے برے انجام سے دوچار کرسکتی ہے۔

ایمان اور کفر کی حقیقت

دین کے ہر عمل کا ایک ظاہری قالب ہوتا ہے اور ایک اس کی حقیقت۔ ایمان کا ظاہری قالب شہادتین یعنی اللہ کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت ہے۔ مگر اصلاً یہ دنیا کی سب سے بڑی سچائی کا اعتراف ہے۔ یہی اس کی حقیقت ہے۔

قرآن مجید میں ایمان کی اس حقیقت کو کئی جگہ واضح کیا گیا۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ ایمان و عمل صالح کی وہ اصطلاح جو نجات کا معیار ہے، اس میں عمل صالح کے ساتھ ایمان کے بجائے سچائی کے اعتراف کا ذکر کر دیا گیا، (القیامہ 31:75، الیل 6:92)۔

قرآن مجید دین کے اہم ترین ظاہری احکام کے قالب کے ساتھ ان کی روح پر ضرور متوجہ کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر صرف قالب ہی کو اختیار کیا جائے گا تو انسان میں حقیقی تبدیلی کبھی نہیں آتی۔ وہ کچھ رسمی چیزیں اختیار کر لے گا، مگر اندر سے نہیں بدلے گا۔ مگر جب قوموں پر زوال آتا ہے تو مذہبی لوگوں سے روح ختم ہو جاتی ہے اور صرف قالب رہ جاتا ہے۔ جس کے بعد لوگ بظاہر بہت دیندار نظر آتے ہیں، مگر اندر سے ہر قسم کی معصیت سے بھر جاتے ہیں۔

اسی ایمان کو لے لیجیے۔ جب اس کی روح ختم ہو جائے تو ہر شخص کو کلمہ اور اس کے فضائل از بر ہوتے ہیں، مگر وہ ہر قدم پر سچائی کے انکار پر جیتا ہے۔ وہ اللہ کو ایک اور نبی کو ایک پیغمبر صرف اس لیے مانتا ہے کہ یہ اس کا پیدائشی عقیدہ ہوتا ہے جس سے اس کے تعصّبات وابستہ ہوتے ہیں۔ مگر اسے سچائی کو اس وجہ سے ماننے کی عادت نہیں ہوتی کہ وہ ایک سچائی ہے۔

جس کے بعد جو سچائی اپنے مفاد، خواہش، انا، اور تعصب کے مطابق ہو انسان صرف اسی کو قبول کرتا اور باقی کو رد کر دیتا ہے۔ یہود موسیٰ علیہ السلام کو اپنا پیغمبر مانتے اور عیسیٰ علیہ السلام کو جادوگر قرار دیتے ہیں۔ مشرکین حضرت ابراہیم کو مانتے اور حضور کے منکر ہو جاتے ہیں۔ اور آج کا مسلمان حضور کو مانتا ہے، مگر اپنے زمانے کے ہر اس شخص کی بات رد کر دیتا ہے جو ان کے تعصّبات کے خلاف حضور ہی کی بات کو ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہی کفر کی حقیقت ہے۔

اعتراف کی نفسیات اور سماج

شیطان اللہ تعالیٰ کی بارگارہ سے جب دھتکارا گیا تو گرچہ اس کا سبب اس کی سرکشی تھی، مگر اس سرکشی تک جو چیز اسے لے کر گئی وہ عدم اعتراف کا جذبہ تھا۔ شیطان نے حضرت آدم سے حسد کی اور ان کے اس مقام کا اعتراف نہیں کیا جو اللہ نے ان کو دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنا ہی وہ بلند مقام کھو بیٹھا جو اللہ نے اسے دے رکھا تھا۔

ہمارے معاشرے میں بھی بدقسمتی سے یہ رویہ عام ہے کہ لوگ دوسروں کا اعتراف نہیں کرتے۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ خوبی دیکھتے ہیں اور ایسے بن جاتے ہیں جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ بہترین کام کو ہوتا دیکھتے ہیں لیکن ظاہر ایسے کرتے ہیں جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا۔

اس سے بدتر رویہ یہ ہے کہ انسان دوسرے کی خوبیوں میں صرف کمزوریاں اور خامیاں تلاش کرتا رہے۔ ان کے نقائص دریافت کرتا رہے۔ اس طرح کا رویہ جیسا کہ شیطان کے معاملے میں تھا، حسد اور تکبر کی علامت ہوتی ہے یا پھر احساس کمتری کا اظہار ہوتا ہے۔

اعلیٰ انسان وہ ہوتا ہے جو دوسروں کی خوبیوں کی تحسین کرے۔ ان کا اعتراف کرے۔ ان کو بیان کرے۔ یہ کسی انسان کے آگے جھک جانے کا نہیں بلکہ خدا کی تقسیم کے آگے جھک جانے کا نام ہے۔ یہ جذبہ انسان میں جذبہ جگاتا ہے کہ وہ بھی محنت اور دعا کے ذریعے سے ایسی ہی خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کرے۔ یہ رویہ جس سماج میں عام ہو جاتا ہے وہاں لوگ اعلیٰ انسانوں کے قدردان ہو جاتے ہیں۔ وہاں ہر منصب اور ہر عہدے پر قابل اور اہل لوگ تعینات ہوتے ہیں۔ وہاں میرٹ کا چلن عام ہوتا ہے۔ انصاف اور خیر وہاں عام ہو جاتی ہے۔

اعتراف کی نفسیات ایک سادہ معاملہ نہیں۔ اس کا اثر آخر کار پورے سماج کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔ یہی وہ سبق ہے جو آج ہمارے لوگوں کو سیکھنے کی ضرورت ہے۔

مکالمہ اور غیر متعلق گفتگو

سچائی کی تلاش اور اس کا اعتراف اس دنیا میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مکالمہ اس منزل کی طرف لے جانے کا ایک راستہ ہے۔ لیکن مکالمہ صرف اسی شکل میں مفید ہوتا ہے جب لوگوں کو غیر متعلق گفتگو اور متعلق گفتگو میں فرق کرنے کی عادت ہو۔

غیر متعلق گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک سچائی آپ کے سامنے رکھی جائے تو آپ اس پر غور کرنے کے بجائے فوراً ایک ایسا جملہ زبان سے نکال دیں جس کا اصل معاملے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جس کے بعد پوری گفتگو اور بات کا رخ پھر جاتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ کسی شخص کو پاکستان کے حوالے سے معلومات دینا چاہیں اور یہ بتائیں کہ پاکستان چودہ اگست 1947 کو وجود میں آیا۔ اس کے جواب میں وہ فوراً کہے مگر ہندوستان تو پندرہ اگست 1947 کو وجود میں آیا تھا۔ یہ دوسری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن اس کا پہلی بات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گفتگو کا رخ پاکستان کے بجائے ہندوستان کی طرف مڑ جاتا ہے۔ کہنے والا آپ کو پاکستان کے متعلق بتانا چاہتا ہے اور گفتگو ہندوستان پر شروع ہو جاتی ہے۔ یوں مکالمہ ایک لایعنی گفتگو میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

یہ غیر متعلق گفتگو شرارتاً بھی کی جاتی ہے اور عادتاً بھی۔ شرارتاً یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو چاہتے کہ عام لوگ کسی سچائی تک نہ پہنچیں۔ چنانچہ جیسے ہی کوئی سچ بات سامنے آتی ہے وہ فوراً ایک غیر متعلق بات شروع کر کے گفتگو کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ عادتاً یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو ہر جگہ اپنی اہمیت کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی بھی معاملے میں کود کر اپنی معلومات اور خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر اس کے نتیجے میں بھی اصل بات پیچھے چلی جاتی ہے۔

چنانچہ جس شخص کو سچائی سے دلچسپی ہو اسے ہمیشہ متعلق اور غیر متعلق گفتگو میں فرق کرنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ ورنہ کسی مکالمہ اور مباحثہ سے وقت کے زیاں اور تعلقات کی خرابی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

داؤد علیہ السلام کی تنہائی

قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق یہ بات بیان ہوئی ہے کہ جب وہ اللہ کی حمد کے نغمے بکھیرتے تو پہاڑ اور پرندے ان کے ہم آواز ہوجاتے تھے۔قرآن مجید پہاڑوں اور پرندوں کا ذکر تو کرتا ہے، مگر یہ نہیں بتاتا کہ اس حمد کا ساتھ دینے کے لیے انسان بھی آئے تھے۔ہاں وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ ان کی زبانی بنی اسرائیل پر لعنت بھی کی گئی ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی کے واقعات معلوم ہیں۔ان کو اپنی زندگی میں ایک زبردست جدوجہد کرنا پڑی۔خدا کی حمد کے یہ غیر معمولی نغمے بکھیرنے والی ہستی کو کوئی پناہ میسر نہ تھی۔ایک موقع پر تو انھیں جان بچانے کے لیے فلسطین چھوڑ کر مکہ میں پناہ لینا پڑی۔بنی اسرائیل ان کے بدترین دشمن ہوگئے تھے۔حالانکہ ایک زمانے میں یہ ان کے وہ ہیرو تھے جنھوں نے ان کے دشمن جالوت بادشاہ کو اس وقت تن تنہا قتل کیا تھا جب کسی میں اس کے مقابلے کی ہمت نہ تھی۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ خدا کی حمد کے نغمے بکھیرنے والوں کو انسانوں کی دنیا میں بالعموم کوئی پذیرائی نہیں ملتی۔لوگ اپنے قومی جذبات اور مقاصد کی تسکین کے لیے ہیرو چاہتے ہیں۔ انھیں ایسے کسی شخص سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جو حق بیان کررہا ہو۔چاہے وہ داؤد علیہ السلام ہوں، چاہے عیسیٰ علیہ السلام ہوں، چاہے سرکار دو عالم ہوں یا کوئی اور نبی۔سب کے ساتھ لوگ ایک ہی سلوک کرتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی حمد کے نغمے بکھیرنے والے لوگ خدا کی طرف ہی سے اٹھتے ہیں۔جس کے بعد وہ سچ بھی بیان کرتے ہیں۔تنقید بھی کرتے ہیں۔غلطیوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔گمراہیوں کو ہدف بھی بناتے ہیں۔اس کی برداشت کسی کو نہیں ہوتی۔جس کے بعد

لیڈر شپ ان لوگوں کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ وہ لوگوں کو ان سے بدگمان کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا استعمال کرتی ہے۔الزام، بہتان، دشنام اور کذب وافتراء کا ایک طوفان اٹھ جاتا ہے۔ گردن تک جذبات اور جہالت میں ڈوبے عوام الناس کو اس سے کیا دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ اصل بات جاننے کی کوشش کریں۔ وہ بھی اس کے خلاف اٹھ جاتے ہیں۔

اس کے بعد وقت کے ہر ''داؤد'' کے ساتھ ایک ہی معاملہ ہوتا ہے۔اس کی حمد پر پرندے اور پہاڑ خدا کی تسبیح کے لیے جمع ہو جاتے ہیں، مگر اس پر خدا کی زمین تنگ ہو جاتی ہے۔ چاند، سورج، تارے، پرندے اور پہاڑ سب اس کے ساتھ ہوتے ہیں، مگر انسانوں کی دنیا میں وہ بالکل تنہا رہ جاتا ہے۔قومی تعصّبات کے لیے اٹھنے والوں پر زمین کے خزانے کھلے ہوتے ہیں اور اس کو اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خدا کے دشمن زمین میں بے خوف وخطر دندناتے پھرتے ہیں اور اسے جان ہتھیلی پر لیے نکلنا پڑتا ہے۔

بظاہر یہ بہت بڑا المیہ ہے۔لیکن یہ المیہ داؤد کا نہیں ہوتا۔ آل داؤد کا بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کے بارے میں داؤد علیہ السلام ہی نے زبور میں اعلان کیا تھا اور جسے قرآن نے زبور کا حوالہ دے کر پوری قوت کے ساتھ دہرادیا کہ زمین کے وارث آخر کار انھی لوگوں کو بنا دیا جائے گا۔ یہ المیہ اس قوم کا ہوتا ہے جس میں یہ واقعہ پیش آ رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ آخر کار ایسے لوگوں پر خدا کی لعنت کر دی جاتی ہے۔اس لعنت کا اعلان داؤد علیہ السلام نے بھی کیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی کیا تھا۔

یہ سانحہ بنی اسرائیل میں بھی پیش آیا اور بنی اسماعیل میں بھی پیش آیا۔ یہ پچھلی امت کی بھی کہانی تھی اور اس امت کی بھی کہانی ہے۔اس لیے جب کسی قوم میں کوئی داؤد تنہا رہ جائے تو یہ ڈرنے کا مقام ہوتا ہے۔ داؤد کے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔ کیونکہ اس کے بعد خدا کی لعنت آتی ہے۔

علم اور اخلاق

جن احباب نے اس خاکسار کی کتاب ''تیسری روشنی'' پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ فقیر سچائی کی جستجو رکھنے والا ایک طالب علم ہے۔ یہی جستجو اسے فرقہ وارانہ تعصّبات سے اٹھا کر قرآن مجید کی اس آخری اور حتمی سچائی تک لے کر آ گئی جو اس دنیا میں رب العالمین اور اس کے آخری پیغمبر کی بات جاننے کا سب سے مستند ذریعہ ہے۔

مذاہب عالم اور مسلمانوں کے باہمی فرقوں کے اختلافات کی تاریخ سے گزرتے ہوئے اس طالب علم کو جو چیز سب سے زیادہ اہم محسوس ہوئی وہ یہ تھی کہ علم کی دنیا میں اختلاف رائے کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس لیے اہل علم میں اختلاف رائے ہوتا بھی رہتا ہے۔ اس سے کبھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی بلکہ سوچ وفکر کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔

خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لوگ مسلمہ اخلاقی اصول پامال کر کے علمی اختلاف کو عناد میں بدلتے اور الزام، بہتان، غلط بیانی اور اپنے سے جدا رائے رکھنے والوں کی بات کو بدل کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے والا ان سے نفرت کرنے لگے۔ یہ رویہ کچھ تو جذباتی لوگ اختیار کرتے ہیں جو صاحب علم ہونے کے باوجود جذباتیت کا شکار ہوتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی سمجھ اور علم بہت سطحی ہوتا ہے لیکن شوق یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں ان کی بھی دھوم ہو۔ کسی معروف اور بڑے آدمی پر کیچڑ اچھال کر سستی شہرت حاصل کرنا ایسے لوگوں کے لیے آسان نسخہ ہوتا ہے۔

ایک مومن سے یہ مطلوب ہے کہ ایسے تمام معاملات میں وہ علمی اختلاف اور اخلاق کی پامالی میں فرق کرنا سیکھے۔ اختلاف جب تک علمی ہے، اسے سنا اور پڑھا جائے۔ جب معاملہ اخلاق کی پامالی یعنی الزام و بہتان، جھوٹ و غلط بیانی تک پہنچ جائے تو ایک مومن پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ

ایسی گندگی سے فوراً خود کو دور کرے۔ ایسی چیزوں کا پڑھنا، پھیلانا اور ان کی تصدیق کرنا آخرت کی سخت پکڑ کا سبب بن جائے گا۔ حبیبِ خدا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واضح اصول بتا دیا ہے کہ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو آگے بڑھا دے۔ معاملہ اگر ثقہ آدمی، کسی عالم یا محقق پر الزام و بہتان کا ہے تو اور سنگین ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید نے واقعہ افک کے موقع پر سورہ نور میں یہ واضح اصول بتا دیا ہے کہ ایسے کسی بھی موقع پر بندہ مومن پر لازمی ہے کہ بدگمانی کرنے کے بجائے حسن ظن سے کام لیں۔ (النور 12:24)

اگر کوئی رائے قائم کرنا ضروری ہے تو پھر پہلے پوری تحقیق کریں۔ الزام لگانے والے سے واضح ثبوت مانگا جائے۔ اس کے بعد جس پر الزام لگایا جا رہا ہے، اس سے وضاحت لی جائے۔ اس کے بعد ہی انسان کا یہ حق ہے کہ کسی کے بارے میں کوئی منفی رائے قائم کرے۔ اس سے ہٹ کر جس کسی نے کوئی رویہ اختیار کیا وہ قیامت کے دن بری طرح ذلیل کیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ بیشتر لوگوں منفی باتیں اسی لیے کرتے ہیں کہ معاشرے میں ایسی باتوں کے سننے، داد دینے اور سنی سنائی بات کو پھیلانے والے لوگ موجود رہتے ہیں۔ ایسے لوگ پہلوں سے کم مجرم نہیں ہیں۔

عام اور درمیانی علمی سطح کے لوگوں کو اپنی توجہ علمی اختلافات کے بجائے ایمان واخلاق کی اصل دینی دعوت تک محدود رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اسی پر ان کی نجات کا انحصار ہے۔ ایسے لوگوں کی یہ استعداد ہی نہیں ہوتی کہ وہ علمی معاملات کی باریکیاں سمجھ سکیں۔ علمی معاملات میں اختلاف رائے علماء و محققین کا کام ہوتا ہے۔ وہ یہ کرتے ہیں تو ان کو صحتِ فکر حاصل ہوتی ہے۔ معاشرہ علمی طور پر ترقی کرتا ہے۔ مگر عوام اور اوسط درجہ کے لوگ جیسے ہی اپنی سطحی علمی حیثیت کے ساتھ علمی معاملات میں چھلانگ لگاتے ہیں، وہ اپنی خرابی کا خود ہی سامان کر دیتے ہیں۔

نبی رحمت کی شادیاں: کچھ سوالات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو نشانہ بنانے والے مستشرقین نے ہمیشہ دو چیزوں کو نمایاں کیا ہے۔ ایک آپ کی شادیاں اور دوسری آپ کی جنگی مہمات۔ یہ مستشرقین زیادہ تر مسیحی رہے ہیں جن کے مذہب میں رہبانیت کی بھرپور آمیزش ہوگئی ہے۔ رہبانیت کے تصورات کے تحت شادی نہ کرنا ایک بہترین عمل اور جنگ وجدل سے بچنا عین عبادت ہے۔ اس پس منظر میں ان لوگوں کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سیرت مبارکہ میں یہی چیزیں سب سے زیادہ قابل اعتراض لگتی ہیں۔ آج کل بھی وقفے وقفے سے مغرب میں توہین رسالت کے جو واقعات کارٹون اور فلموں کی شکل میں سامنے آتے ہیں ان میں انھی دو چیزوں کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ پیش نظر مضمون میں ہم حضور کی شادیوں کے حوالے سے بعض حقائق پر توجہ دلا رہے ہیں تاکہ اپنے پرائے شادیوں کی تعداد کے بجائے ان حالات کو دیکھ کر حضور کی سیرت کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں۔ جہاد پر تبصرہ کبھی بعد میں کیا جائے گا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے متعدد شادیاں کیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پچیس برس عفیف زندگی گزارنے کے بعد آپ نے حضرت خدیجہ سے نکاح کیا اور پھر اگلے پچیس برس تک آپ نے کسی اور خاتون سے شادی نہیں کی۔ عرب کے کلچر میں کسی مرد کی دوسری تیسری شادی ایک معمولی بات تھی۔ مگر آپ نے نہ صرف ایسا نہ کیا بلکہ جب اعلان نبوت کے بعد قریش کے سرداروں نے آپ کو پیشکش کی کہ عرب کی حسین ترین عورتوں کو آپ سے بیاہ دیا جائے تو آپ نے ایسی کسی پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ جو نقشہ مستشرقین کھینچتے ہیں اس نقشے کا انسان جوانی میں شادی سے قبل کیسے بے داغ رہ سکتا ہے؟ شادی کے بعد وہ پچیس برس تک کیسے صرف ایک خاتون سے نکاح پر قناعت کر سکتا

ہے؟ جس شخص کی جوانی کی سیرت یہ ہو وہ بڑھاپے میں اچانک شادیوں کا شوق کس طرح خوشی خوشی پال سکتا ہے؟ مزید یہ کہ آپ کی شادیوں کی نوعیت یہ نہیں کہ آپ نے ایک دم عورتوں سے اپنا حرم بھرلیا ہو۔ بلکہ ایک نبی، رسول، لیڈر اور ایک رول ماڈل کے طور پر جب جب ضرورت لاحق ہوئی آپ نے شادیاں کیں۔ پھر جن خواتین سے شادی کی ان میں سیدہ عائشہ کو چھوڑ کر سب بیوہ، مطلقہ اور بال بچے دار خواتین تھیں۔ اس پر بھی آپ پر یہ پابندی تھی کہ آپ اپنی کسی بیوی کو طلاق دے کر خود سے الگ نہیں کر سکتے تھے نہ ایک مخصوص دائرے سے باہر شادی کر سکتے تھے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت خدیجہ کے بعد بیوی کی حیثیت سے جو خاتون آپ کی زندگی میں آئیں وہ ایک نوجوان کنواری خاتون یعنی سیدہ عائشہ تھیں۔ احادیث اور سیرت کی کتابوں میں یہ بات واضح ہے کہ سیدہ ہی آپ کے لیے سب سے محبوب ہستی تھیں۔ مگر اس کے باوجود آپ نے جب متعدد شادیاں کیں تو عدل کی غرض سے خود پر یہ پابندی عائد کردی کہ آپ کا وقت تمام بیویوں میں یکساں تقسیم ہوگا۔ گویا محبوب بیوی کے ساتھ جو وقت آپ گزار سکتے تھے اس کا ایک بڑا حصہ اب دوسری خواتین میں تقسیم ہو گیا۔

جس سیرت کا نقشہ یہ مستشرقین کھینچتے ہیں کیا اس نقشے کا انسان اسی طرح بیوہ، مطلقہ خواتین سے شادیاں کر کے خود پر طرح طرح کی پابندیاں لگاتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ جوانی کے تلاطم سے بے داغ گزرنے والا انسان بڑھاپے کی پرسکون لہروں میں اپنی کشتی بے قابو ہونے دے؟ شادیاں جب خواہش نفس کے لیے کی جاتی ہیں تو خوبصورت ترین عورتوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ عرب کے سردار نے جن کے جنبش ابرو پر سب کچھ ممکن تھا کیا ایسی ہی خواتین سے شادیاں کی تھیں؟ اگر ان سب سوالوں کے جواب نفی میں ہیں اور بلاشبہ نفی میں ہیں پھر درود وسلام بھیجئے اس ذات پر جس نے اپنے عائلی سکون کو اللہ کے حکم اور معاشرے کی ضروریات پر قربان کردیا۔

سیرت مصطفیٰ بے مثل باخدا

حلم اور صبر کسی انسان کی شخصیت کو جاننے کا سب سے زیادہ اہم پیمانہ ہوتا ہے۔ پھر حلم کو جانچنے کے بھی کئی مقامات ہو سکتے ہیں جن میں سے دو ایسے ہیں جو کسی انسان کے حلم کا آخری پیمانہ ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص نے اپنی اولاد کے حوالے سے پیش آنے والے صدمات پر کس رویے کا مظاہرہ کیا اور دوسرا یہ کہ اپنے دشمنوں کے ظلم وزیادتی کے باوجود ان پر قابو پانے کے بعد انسان کا رویہ کیسا رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ان دونوں مقامات پر حلم، صبر، برداشت اور عفوودرگزر کے آخری مقام پر نظر آتی ہے۔ پہلے اولاد کے معاملے کو لے لیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے متعدد اولادوں سے نوازا تھا۔ حضرت خدیجہ سے آپ کی چار صاحبزادیاں حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمہ پیدا ہوئیں۔ جبکہ دو بیٹے حضرت قاسم اور حضرت عبد اللہ پیدا ہوئے جن کا لقب طاہر وطیب تھا۔ آپ کے ایک صاحبزادے حضرت ابراہیم بی بی ماریہ سے پیدا ہوئے۔

حضرت فاطمہ کو چھوڑ کر آپ کی تمام اولادیں آپ کی آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ تینوں بیٹے بچپن کی عمر ہی میں انتقال کر گئے۔ جبکہ تینوں بیٹیاں عین جوانی میں دنیا سے رخصت ہوئیں۔ حضرت فاطمہ کا انتقال بھی نبی کریم کی رحلت کے صرف چھ ماہ بعد ہو گیا۔ یہ باتیں کتابوں میں پڑھنا بہت آسان ہے۔ لیکن ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ ہم میں سے کسی شخص کے ساتھ اگر یہ سانحہ پیش آجائے تو کیا ہوگا۔ ہم اپنی اولاد کا معمولی سا دکھ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر سرکار دوعالم کی ذات پر یہ آزمائش ٹوٹی کہ تینوں بیٹے بچپن کی اس عمر میں جب انسان بچوں کی ایک ایک ادا پر نثار ہو رہا ہوتا ہے، انتقال کر گئے اور بیٹیاں جوانی کی اس عمر میں جب موت کا تصور کرنا بھی بوجھل معلوم ہوتا ہے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صدمات کو کمال حوصلہ کے ساتھ برداشت کیا۔ آپ کے

آخری صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال جنگ تبوک کے بعد بالکل آخری دور میں ہوا جب آپ کے وہ الفاظ تاریخ میں نقل ہو گئے جو آپ نے اس موقع پر ارشاد فرمائے تھے: ''ہماری آنکھیں بہہ رہی ہیں، دل افسردہ ہیں، مگر ہم زبان سے صرف وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے''۔ دنیا میں کوئی اور شخص ہے جو صبر و برداشت کی یہ نظیر پیش کر سکے۔

دشمنوں کے معاملے میں بھی آپ کا حلم درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ آپ کو اللہ کے راستے میں ہر وہ تکلیف دی گئی جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے اپنے قریب ترین رشتے داروں اور ہم قبیلہ لوگوں کی بدترین مخالفت جھیلی۔ صبح و شام طرح طرح کے توہین آمیز کلمات، خطابات اور طنزیہ جملے سنے۔ ہر طرح کا الزام، بہتان، ہجو گوئی، استہزا اور سوشل بائیکاٹ سہا۔ عین حرم پاک میں، مکہ کے بازاروں میں اور طائف کے پہاڑوں پر آپ اور آپ کے ساتھی ہر طرح کی مخالفت، ذلت اور تشدد کا شکار رہے۔ ہجرت کے بعد کبھی جنگ و جدل کی سختیاں جھیلیں تو کبھی محبوب ترین رشتے داروں اور عزیزوں کی کفار کے ہاتھوں انتہائی دردناک موت کا سانحہ جھیلا۔ کبھی یہود و منافقین کے ہاتھوں اپنے اہل خانہ پر بدترین بہتانوں کو برداشت کیا تو کبھی اپنی ذات کے حوالے سے غلیظ اسکینڈلوں کو سہا۔ مگر کبھی بد دعا دی، نہ انتقام لیا۔

پھر ایک ایک کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہر ہر دشمن پر قابو دے دیا۔ آپ چاہتے تو ہر دشمن کو ہلاک کر دیتے اور کچھ نہ ہوتا۔ مگر رحمت اللعالمین نے ہر دشمن کو معاف کر دیا۔ ہر ظالم کو بخش دیا۔ ہر قاتل کو چھوڑ دیا۔ جس نے معافی مانگی، جس نے سر جھکایا صرف وہی نہیں بخشا گیا بلکہ بھاگنے والے بھی اس بارگاہ سے پروانۂ عافیت پا گئے۔ اس حلم کے آگے ہر سر ڈھے گیا۔ ہر گردن جھک گئی۔ ہر دشمن دوست اور ہر مخالف گرویدہ ہو گیا۔

صبرِ مصطفیٰ اور سیرتِ مصطفیٰ باخدا بے مثل ہے۔ مگر یہی صبر وہ وصف ہے جس کا کوئی ادنیٰ پرتو بھی مصطفیٰ کے ''عاشقوں'' میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

قرآن مجید اور قطعی الدلالۃ

قرآن مجید کے حوالے سے اس خاکسار کا ایک مضمون ماہنامہ انذار کے اکتوبر 2016 کے شمارے میں شائع ہوا جس میں قرآن مجید کا قطعی الدلالۃ ہونا زیر بحث آیا تھا۔ بعض احباب نے اس ضمن میں کچھ مزید توضیحات طلب کی ہیں۔ متفرق گفتگوؤں میں ان باتوں کو کئی دفعہ دہرانے کے بعد اب اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس معاملے میں اپنا نقطہ نظر ایک دفعہ تحریری طور پر بیان کر دیا جائے تاکہ بار بار سوالات کے جواب نہ دینے پڑیں۔

اس مسئلے کو یہ طالب علم ایک علمی نہیں بلکہ ایمانی پس منظر میں دیکھتا ہے۔ قرآن مجید گرچہ آسمانی کتابوں میں سے ایک کتاب ہونے کی بنا پر ہمارے ایمانیات کا ایک حصہ ہے، لیکن اس خاکسار کے نزدیک اس کا معاملہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام کا وہ ظہور ہے جو نہ کبھی پہلے ہوا نہ کبھی آئندہ ہوگا۔ عام وحی اور سابقہ کتب کے برعکس قرآن مجید کی شان یہ ہے کہ تاریخ نبوت میں پہلی اور آخری دفعہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کے منہ میں اپنا کلام ڈالا۔ اس سے قبل انبیا پر وحی اترتی تھی جو ان کے الفاظ میں کتابوں میں مرتب ہو جاتی تھی۔ مگر قرآن مجید کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے الفاظ کا انتخاب بھی خود کیا ہے۔ پھر لوح محفوظ سے نبی علیہ السلام کے قلب اطہر اور پھر آپ کی زبان مبارک سے آج کے دن تک قرآن کی حفاظت کا بھرپور انتظام کیا گیا ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں نبوت کا ادارہ جو انسانیت کے آغاز سے شروع کیا گیا تھا، انسانی تاریخ کے ایک اہم ترین دور کے آغاز سے پہلے ہی ختم کر دیا گیا۔ اب تا قیامت اللہ اور اس کے آخری نبی کی نسبت سے جو مستند ترین متن ہمارے پاس موجود ہے وہ یہی قرآن مجید ہے جو گویا اب خدا اور اس کے پیغمبر کے قائم مقام ہے۔

اسی پر بس نہیں، قرآن مجید اپنے بارے میں جو کچھ کہتا ہے وہ اس کو مذہب کی پوری روایت میں انتہائی منفرد اور ممتاز کر دیتا ہے۔ چند اہم مقامات ملاحظہ فرمائیے۔

1۔قرآن مجید کلام الٰہی ہے اور اس کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔(البقرہ2:2)

2۔اس کلام کو اللہ نے نازل کیا ہے اور وہی اس کی حفاظت کرے گا۔(الحجر9:15)

3۔اس کلام میں کوئی ٹیڑھ نہیں جو بالکل سیدھی بات کرنے والا کلام ہے(الکہف1-2:15)۔ اسی کو دوسری جگہ واضح عربی کتاب کہا گیا کہ لوگ سمجھ سکیں (یوسف1-2:12)۔

4۔قرآن مجید رب العالمین کا نازل کردہ کلام حق ہے(ال عمران60:3)، اور اس سے ملنے والا علم وہ حق ہے جس کے مقابلے میں ظن وگمان کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔(النجم28:53)

5۔باطل نہ اس کلام کے آگے سے آ سکتا ہے نہ پیچھے سے۔(الفصلت 42:41)

6۔کتاب الٰہی لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے اتاری گئی ہے۔(البقرہ213:2)

7۔یہ کتاب میزان ہے۔یعنی وہ ترازو ہے جس میں رکھ کر ہر دوسری چیز کی قدر و قیمت طے کی جائے گی۔(الشوریٰ17:42)

8۔یہ کتاب فرقان یعنی وہ کسوٹی ہے جو کھرے اور کھوٹے کا فیصلہ کرتی ہے۔(الفرقان1:25)

9۔یہ کتاب تمام سلسلہ وحی پر مہیمن یعنی نگران ہے۔(المائدہ48:5)

10۔یہی وہ کتاب ہدایت ہے جس کو ترک کر دینے کا مقدمہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخاطبین کے حوالے سے پیش کریں گے۔(الفرقان 30:25)

اللہ تعالیٰ نے دوٹوک الفاظ میں قرآن مجید کی یہ حیثیت بیان کی ہے۔اس لیے جو کوئی بھی قرآن کے بارے میں قلم اٹھائے تو وہ سوچ لے کہ وہ اس شان کے کلام الٰہی کی بارگاہ میں کلام

کرنے کی جرأت کررہا ہے۔

اس تمہید کے بعد آیئے قرآن مجید کے قطعی الدلالۃ ہونے کی طرف۔ قطعی الدلالۃ کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ کی دلالت ان کے مفہوم پر قطعی ہے۔ اس بات کو نہ ماننے کے دو بدیہی نتائج نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ زبان و بیان کے مسلمہ اصولوں کو پامال کرکے قرآن مجید کی کسی آیت کا وہ مطلب نکالا جاسکتا ہے جو اس کے ظاہری الفاظ سے نہیں نکلتا۔ دوسرا یہ کہ کسی آیت کے بیک وقت کئی متضاد مفاہیم بیان کیے جائیں اور ان سب کو ٹھیک بھی مانا جائے۔ یہ کلام کا اتنا بڑا عیب ہے کہ قرآن مجید کو تو چھوڑیے، اس عاجز جیسا ایک حقیر مصنف بھی اپنی تحریروں کی طرف اس طرح کے عیب کی نسبت کو اپنے لیے باعث عار سمجھے گا۔

واضح رہے کہ قرآن مجید کسی موقع پر قطعی الدلالۃ کے الفاظ استعمال کرکے اسے کہیں براہ راست زیر بحث نہیں لایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صفت ہر اس کلام کا لازمی جز ہے جس میں متکلم کے پیش نظر اپنی بات کا ابلاغ اور درست بات بتانا ہوتا ہے۔ کسی متکلم کے پیش نظر اگر کلام کا ابلاغ ہی نہیں یا اسے اسالیب کلام پر دسترس نہیں تو یہ دوسری بات ہے۔ ورنہ اس مسلمہ کو مانے بغیر نہ انسان کے علم بیان کی کوئی حیثیت ہے، نہ کوئی گفتگو، مکالمہ، معاہدہ بامعنی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے پیش نظر اگر ہدایت کا ابلاغ ہے اور ساتھ میں وہ ساری حقیقتیں پیش نظر رہیں جو اوپر بیان ہوئیں تو یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ قرآن قطعی الدلالۃ نہیں۔ یہ کیسے مان لیا جائے کہ قرآن کے ظاہری الفاظ سے جو مفہوم زبان و بیان کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں نکل رہا ہے، اسے چھوڑ کر خارج سے ڈالے گئے کسی مفہوم کو قبول کرلیا جائے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک وقت میں چار متضاد معنی کلام میں پائے جارہے ہوں۔

تاہم جیسا کہ ہم نے پچھلے ایک مضمون میں بعض مثالوں سے یہ عرض کیا تھا کہ اہل علم کے

سامنے مسئلہ یہ آ گیا تھا کہ بعض مسلمہ حقائق قرآن مجید کے بیانات کے برعکس بات سامنے لاتے ہیں۔ تاہم اُس مضمون میں ہم نے یہ بات بھی واضح کردی تھی کہ امام فراہی نے قرآن مجید کی روشنی میں علم کی دنیا کی حد تک اس مسئلے کو حل کردیا ہے۔ گرچہ تعصّبات کی دنیا میں کوئی مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ یہی بات (البقرہ 213:2) میں بھی بیان ہوئی ہے کہ لوگ تو کتاب الٰہی کے آنے کے بعد بھی ایک دوسرے کی ضد میں آکر اختلاف کرتے رہتے ہیں۔

اس دنیا میں لوگوں کا یہ حق ہے کہ وہ جس بات کا چاہے انکار کردیں اور جو چاہیں اختلاف کریں۔ ان کا یہ حق سر آنکھوں پر۔ مگر پھر دیانت داری کا تقاضہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے ان صریحی بیانات کے بعد اگر قرآن قطعی الدلالۃ نہیں تو پھر دنیا کے کسی بھی کلام کو قطعی الدلالۃ نہیں مانا جاسکتا۔ حتیٰ کہ ان چیزوں کو بھی نہیں جن چیزوں کو قرآن پر حاکم بنانے کے لیے قرآن کے قطعی الدلالۃ ہونے کا انکار کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی صورتحال پر سب سے اچھا تبصرہ مولانا مودودی نے کیا ہے کہ جو کچھ یہ حضرات قرآن مجید کے ساتھ کرتے ہیں، وہ اگر ان کی تحریروں کے ساتھ کیا جائے تو یہ لوگ چلا اٹھیں گے۔

ایک دلچسپ بات یہ کہی جاتی ہے کہ قرآن کا کچھ حصہ قطعی ہے اور کچھ نہیں۔ ہم دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں اس طرح کی رائے لوگ اس لیے قائم نہیں کرتے کہ انھیں قرآن سے اس کا کچھ اشارہ ملا ہے۔ بلکہ جیسا کہ امام فراہی کے حوالے سے عرض کیا گیا کہ ان کے کچھ مسائل ہیں جو حل نہیں ہوتے۔ ان کی خدمت میں صرف یہی درخواست ہے حضور کچھ زاویہ نظر بدلیں۔ ذہن کو وسیع کریں۔ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اوپر ہم نے اللہ کا فیصلہ صاف الفاظ میں سنایا ہے کہ کتاب الٰہی لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرنے آتی ہے، (البقرہ 213:2)۔ اگر قرآن ظنی الدلالۃ ہے اور ایک وقت میں چار متضاد مفاہیم نکلنے کی گنجائش ہے تو پھر کتاب الٰہی کسی اختلاف کا فیصلہ کیسے

کرسکتی ہے؟ اگر آپ اپنے مقاصد کے لیے یہ کریں گے تو پھر جان لیں کہ بات یہاں تک نہیں رکے گی، پھر باقی لوگ اپنے اپنے مقاصد کے لیے یہی کام کریں گے۔ آپ فقہی احکام میں یہ کام کریں گے دوسرے ایمانیات میں یہ کام کردیں گے۔

اب یہ بھی دیکھ لیجیے کہ جب الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں مانی جاتی تو اس اصول کو اپنا کر لوگ قرآن مجید کے ساتھ کیا کچھ کرتے ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہیں۔ غیر اللہ کو پکارنا، مدد مانگنا، دعا کرنا یہ سب قرآن سے ثابت ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک ایک نئی نبوت کا اعلان خود قرآن میں موجود ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک صحابہ کرام کا ارتداد اور نبوت کے بعد امامت کے سلسلے کا بیان خود قرآن سے ثابت ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک معجزات قرآن اور تمام خارق العادات واقعات جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں وہ معنی و مفہوم نہیں رکھتے جو ظاہری الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر مستشرقین کا گروہ ہے جو قرآن مجید سے کبھی گرامر کی غلطیاں نکالتا ہے اور کبھی اسے ساتویں صدی عیسوی کی سائنس کا ناقص بیان کہتا ہے۔

یہ سارے نقطہ ہائے نظر اصل میں قرآن مجید کے انھی بیانات کو نظر انداز کرنے سے پھوٹے ہیں جو اوپر خود قرآن مجید کے حوالے سے بیان ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے جو کچھ بھی سطحی باتیں کی جاتی ہیں، ہم قارئین کی خدمت میں صرف یہی عرض کریں گے کہ اگر وہ ان باتوں کو درست سمجھتے ہیں تو قرآن کو تختۂ مشق بنانے سے قبل پہلے یہ تحریریں لکھنے والوں کے کلام پر انھی اصولوں کو منطبق کرکے ذرا وہ سب کچھ کریں جو لوگ قرآن کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس نہ اتنا وقت ہے نہ یہ کرنے کا کوئی کام ہے کہ ہم قطعی الدلالۃ کے بدیہی وصف کو نہ مان کر دوسروں کی کسی تحریر کا پوسٹ مارٹم ایسے ہی کریں جیسا سلوک وہ قرآن مجید کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم

اپنے قارئین پر صرف ایک حقیقت واضح کرنا چاہ رہے ہیں۔ وہ یہ کہ اوپر جو کچھ قرآن مجید کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے وہ انھوں نے کسی اور دوسری چیز کے بارے میں نہیں کہا۔ قرآن مجید کے سوا کسی اور مذہبی کتاب، کسی پیغمبر سے منسوب کلام، کسی عالم اور محقق کی رائے کے بارے میں اللہ تعالیٰ اس طرح کی کوئی بات نہیں کہتے۔ اگر قرآن قطعی الدلالہ نہیں تو کچھ اور بھی نہیں ہوسکتا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب یا حیثیت کو کسی پہلو سے کم کرنے کی جرأت کررہے ہیں۔ رسول کی ہستی دین کا ماخذ ہے۔ سرکار دوعالم کی عطا کی ہوئی ہر چیز قرآن ہی کی طرح حجت ہے۔ لیکن آپ نے جو دین قرآن کی طرح اجماع وتواتر سے ہم تک منتقل کیا ہے وہ سنت یا دین کا عملی ڈھانچہ ہے۔ باقی جو ذخیرہ حدیث ہمارے سامنے موجود ہے وہ بڑا قیمتی ہے مگر اسے لوگوں نے اپنی صوابدید پر جتنا چاہا اور جس نے چاہا آگے منتقل کیا۔ اس کی حفاظت کا وعدہ اور اہتمام نہ اللہ نے کیا، نہ سرکار دوعالم نے کوئی اہتمام کیا نہ خلفائے راشدین نے خود یہ کام باہتمام کیا نہ اپنی حکومت کے ذریعے سے اس حوالے سے ایسا کوئی کام کیا جیسا انھوں نے حفاظت قرآن کے لیے کیا تھا۔ یہ ایک ناقابل تردید تاریخی مسلمہ ہے۔ اس کے بعد جو کچھ منتقل ہوا وہ ہمارے آقا علیہ السلام سے منسوب ہونے کی بنا پر سر آنکھوں پر، لیکن اسے قرآن مجید ہی کی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم انسانی آمیزش سے در آنے والی خرابیوں سے بچتے ہوئے اس ذخیرے سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

چنانچہ اصولی بات وہی ہے کہ اگر قرآن قطعی الدلالہ نہیں ہے تو پھر کوئی اور چیز بدرجہ اولیٰ نہیں ہے۔ اس لیے طریقہ یہی ہے کہ قرآن مجید کی وہ حیثیت مان لی جائے جو اللہ تعالیٰ نے خود

بیان کی ہے۔یعنی یہ حکم ہے جو ہر اختلاف کا فیصلہ کرنے آئی ہے، یہ میزان ہے،فرقان ہے، یہ الحق ہے، کتاب محفوظ ہے، باطل کی دراندازی سے پاک ہے،تمام سلسلہ وحی پر نگراں ہے، صاف، واضح ،سیدھی اور روشن ہدایت ہے۔اس کے بعد ہر مذہبی چیز قرآن کی روشنی میں سمجھی جائے گی۔اس کا امکان پھر بھی رہے گا کہ چار لوگ قرآن کی بات کے چار مختلف مفاہیم بیان کریں۔مگر سب لوگ بیک وقت ٹھیک نہیں ہوسکتے۔زبان و بیان کے مسلمہ دلائل کی روشنی میں غلطی کو واضح کیا جاسکتا ہے۔کسی کو اپنی غلطی کا ادراک نہیں ہو پاتا اور وہ اپنے نقطہ نظر پر قائم رہتا ہے تو گرچہ اس کی غلطی پھر بھی غلطی ہی رہے گی،مگر قیامت کے دن وہ غلطی کے باوجود ایک اجر پائے گا۔

لیکن اگر قرآن کو اصول ہی میں وہ حیثیت نہیں دی گئی جو قرآن مجید کے اپنے بیانات سے واضح ہے تو پھر ایک طرف تو بنیادی ایمانیات اور بنیادی دینی مطالبات میں بھی قرآن کے ہوتے ہوئے گمراہی کا راستہ ہم خود کھول دیں گے اور دوسری طرف قیامت میں اللہ کے حضور اس حال میں پیش ہوں گے کہ قرآن مجید کی اس حیثیت کے انکار کا الزام ہم پر عائد ہوگا جو صریح ترین الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے خود بیان کی ہے۔اب جس میں ہمت ہے وہ روزِ قیامت اللہ کے سامنے کھڑے ہوکر اس صریح انکار کی وضاحت کرتا پھرے۔اس فقیر میں کم از کم یہ جرأت نہیں ہے۔

پس نوشت

ہمارا کام کسی بحث کو ختم کرنا نہیں۔جیسا کہ قرآن مجید کے حوالے سے اوپر بیان ہوا کہ لوگ تو کتاب الٰہی کے آنے کے بعد بھی ضد میں آکر بحث کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بات کو سامنے لایا جائے۔اس کے بعد لوگ جانیں اور ان کا پروردگار۔

عامر خاکوانی

امیتابھ بچن کے خط کے بعد ایک اور خط

''میری پیاری بیٹی لائبہ خاکوانی!

یہ خط میں ستمبر کی نو تاریخ کو لکھ رہا ہوں، سال دو ہزار سولہ اور مقام لاہور شہر ہے، وہی لاہور جسے سو، سوا سو سال پہلے برصغیر کے ایک عظیم لیڈر سر سید احمد خان نے زندہ دلان کا شہر کہا تھا۔ بیٹی لائبہ خان! یہ خط ویسے تو تمہارے ہی نام ہے، مگر اس خوبصورت شہر لاہور، ہمارے پیارے ملک پاکستان بلکہ مسلم دنیا کی ان گنت بچیوں کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ کاش میری یہ تحریر تمہارے ساتھ ان کے دلوں میں بھی اتر سکے۔ کاش رب تعالیٰ ان لفظوں میں وہ فسوں پھونک دیں، جن کا اثر دیر تک رہے۔

میری بیٹی، تم حیران تو ہو گی کہ آج تمہارے باپ نے گفتگو کے لیے خط کا سہارا کیوں لیا۔ ایک وجہ تو یہی ہے کہ میں جو باتیں کرنا چاہتا تھا، وہ ایک سے زیادہ بیٹیوں تک پہنچ سکیں، یہ خیال آیا کہ کبھی لکھے الفاظ زبانی گفتگو سے زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔ اس تحریر کی ایک بڑی وجہ یہ بنی کہ پچھلی رات میں نے مشہور بھارتی اداکار امیتابھ بچن کے بارے میں پڑھا کہ انہوں نے اپنی پوتی اور نواسی کے نام ایک خط لکھا ہے، جس کی وڈیو انٹرنیٹ پر بھی شیئر کی گئی۔ امیتابھ بچن کو تم جانتی ہو گی، وہی طویل قامت اداکار جو بھوت ناتھ فلم میں بھوت بنا تھا، تمہیں یاد ہو گا کہ اس سلسلے کی دوسری فلم بھوت ناتھ ریٹرن ہم نے اکٹھے دیکھی تھی۔

انہوں نے اپنی پوتی ارادھیا بچن اور نواسی نیویا نندا کے نام خط لکھا ہے۔ وہ خط پڑھتے ہوئے مجھے بار بار یہ احساس ہوا کہ مجھے بھی اپنی اکلوتی بیٹی کے نام ایک خط لکھنا چاہیے۔ اپنی بھانجی ایشل فاطمہ، بھتیجی ہما طاہر کو مخاطب کرنا چاہیے، اسلام آباد میں رہنے والی مریم خان اور لاہور کی عنیزہ

جاوید ملک جیسی تمہاری سہیلیوں، بلکہ ان تمام مسلمان بچیوں کے نام یہ خط کرنا چاہتا ہوں، جنہوں نے اگلے چند برسوں میں اپنی تعلیم مکمل کرنی، اپنی عملی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ پہلے میں امیتابھ بچن کے اس خط کی کچھ تفصیل بتانا چاہوں گا، امیتابھ بچن کہتے ہیں،'' آپ دونوں کے نام کے ساتھ چاہے نندا لگے یا بچن، لیکن آپ ایک لڑکی، ایک عورت ہیں! اور چونکہ آپ خواتین ہیں، لہٰذا لوگ آپ پر اپنی سوچ، اپنی حدود تھوپنے کی کوشش کریں گے۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ کس طرح کا لباس پہننا ہے، کس طرح کا برتاؤ کرنا ہے۔ آپ کو کس سے ملنا ہے اور آپ کو کہاں جانا ہے۔ ان لوگوں کے نظریات، فیصلوں کے سائے میں زندگی مت گزارنا، اپنی عقل کے مطابق اپنا انتخاب خود کرنا۔ اس بارے میں کسی کی مت سنیں کہ آپ کو کس سے دوستی کرنی ہے اور کس کے ساتھ نہیں، شادی صرف تب ہی کریں جب آپ واقعی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ لوگ باتیں کریں گے، وہ کچھ خطرناک باتیں بھی کریں گے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو ہر ایک کی بات سننی ہے، اس بات کی کبھی بھی پروانہ کریں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ دوسرے لوگوں کو اپنے لیے فیصلے مت کرنے دیں۔''

میری نورِ نظر، میری لختِ جگر، لائبہ! ممکن ہے یہ خط پڑھ کر تم یہ سوچ رہی ہو کہ اس میں برائی کیا ہے، بچن صاحب نے اپنی پوتی، نواسی کو صرف یہ مشورہ ہی دیا ہے کہ لوگوں کی نہ سنو، اپنے فیصلے کرو اور اپنی عقل کے مطابق فیصلہ کرو۔ بات واقعی سادہ، مگر اس کے اندر ہی ایک فتنہ موجود ہے۔ دیکھو میری بیٹی، تم میں اور امیتابھ بچن صاحب کی پوتی، نواسی میں ایک بڑا، بنیادی فرق ہے۔ وہ ہمارے لیے قابل احترام ہیں، مگر ایک فرق بہرحال ہے۔ تم ایک خدا کو مانتی ہو، اس کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا پیغمبر، آقا اور حقیقی رہنما مانتی ہو۔ ایک مسلمان لڑکی، مسلمان عورت کا زندگی کے بارے میں تصور دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے اندر

اعتماد، مضبوطی، اپنی شخصیت پر یقین، کچھ کر گزرنے کا عزم...... یہ سب ہونا چاہیے، مگر اسے اپنی زندگی اللہ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارنی ہے۔ اس کی زندگی کا فکری، نظریاتی روڈ میپ پہلے سے طے شدہ ہے۔ اپنی عقل و دانش کو وہ استعمال کرتی، اس سے اچھائی برائی میں تمیز کرتی، راہ راست یعنی سیدھے راستے کا انتخاب کرتی اور پھر اپنے رب سے مدد مانگتے ہوئے اس پر چل پڑتی ہے۔ اپنی عقل کو وہ الہامی دانش پر غالب نہیں کرتی۔ جو کچھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہہ دیا، وہ اس کے لیے حرف آخر ہونا چاہیے۔ ہمارے رب نے ہمارے لیے کچھ پابندیاں لگائی ہیں، بہت سے معاملات میں آزادی بھی حاصل ہے۔ کچھ چیزوں کو کرنے سے روکا ہے، بہت سی چیزوں کی اجازت دی ہے۔ میری بچی میری تمہیں یہی نصیحت، وصیت ہے کہ جن باتوں سے رب نے روکا، ان سے دور رہو، تمہاری عقل خواہ جس قدر بہکائے، نفس دلائل دے کہ یہ چھوٹی موٹی باتیں ہیں، کرنے سے کچھ نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ......تم اپنی عقل کو استعمال کرو، مگر رب تعالیٰ کے احکامات سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کا طریقہ وضع کرنے کے لیے۔ جو حدود یا جو لائنز اللہ نے لڑکیوں کے لیے مقرر کر دی ہیں، انہیں کبھی کراس نہ کرو۔ شرم، حیا اسلامی معاشرے کا بنیادی جز ہے۔ ہمارے آقا، ہمارے سردار، سرکار مدینہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر معاشرے کا ایک جوہر ہوتا ہے، حیا اسلامی معاشرے کا جوہر ہے۔ میری بچی اپنی شرم اور حیا کی ہمیشہ حفاظت کرنا۔ اپنی عزت، عصمت کی ہمیشہ جان سے بھی بڑھ کر حفاظت کرنا۔ تم جب سکول حجاب لے کر جاتی ہو، تمہارے چہرے پر حیران کن معصومیت اور نرمی آجاتی ہے، تمہارے باپ کے دل سے ہمیشہ یہی دعا نکلتی ہے کہ زندگی بھر تم ایک باحجاب، باحیا زندگی گزارو۔

میں یہ ہرگز نہیں کہنا چاہتا کہ اپنی زندگی کے فیصلے دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں دے دو۔

نہیں ہرگز نہیں۔ میری خواہش ہے کہ تم میں اعتماد آئے، تمہارے اندر مضبوطی پیدا ہو۔ بطور لڑکی، بطور عورت تم ہرگز کسی سے کم تر نہیں۔ کسی مرد کو کسی عورت پر برتری حاصل نہیں ہے۔ یہ مگر میری خواہش ہے کہ پلیز زندگی میں مرد بننے کی کوشش نہ کرنا۔ تم ایک لڑکی، عورت ہو، کائنات کی خوبصورت ترین مخلوق۔ اس حیثیت سے لطف اٹھاؤ، اللہ نے تمہارے اوپر کچھ فرائض رکھے ہیں ، وہ پورے کرو، تمہارے بہت سے حقوق بھی ہیں، جو تمہیں انشااللہ ضرور ملیں گے۔ تم جانتی ہو کہ گھر میں بطور بیٹی فائدے زیادہ ملے ہیں، حق تلفی کوئی نہیں ہوئی، تمہارے تینوں بھائیوں کی نسبت تمہاری زیادہ باتیں، زیادہ فرمائشیں مانی گئی ہیں۔ اس دن میں نے خود سنا کہ تم نے اپنے بھائی سے کہا کہ میں بابا کی اکلوتی بیٹی ہوں، وہ میری بات نہیں ٹالتے۔ میری بیٹی، میری دعا ہے کہ زندگی بھر یہی طمانیت، آسودگی تمہارے ساتھ رہے۔ اگلے چند برسوں میں تمہارے سامنے یہ سوال بار بار آئے گا۔ میڈیا کے ذریعے، فلموں کے ذریعے تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ ہم لڑکیاں کسی سے کم نہیں، ہم بھی ہر وہ کام کرسکتی ہیں جو مرد کر سکتے ہیں۔ میری بچی، تم سمجھ لینا کہ یہ احساس کمتری کی شکار عورتوں کا بیان ہے۔ لڑکیاں قطعی طور پر مردوں سے کمتر نہیں، مگر ان کا دائرہ کار مختلف ہوسکتا ہے۔ اس سے ان کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ انسانی جسم میں ہاتھ کس قدر اہم ہیں، مگر پیر بھی کم اہم نہیں، ہاتھ کے بغیر بھی جسم ادھورا، پیر کے بغیر بھی انسان معذور ہے۔ کام دونوں کا الگ الگ ہے۔ آنکھوں کا اپنا کام، کان کا الگ اور زبان کا الگ ہے۔ اگر یہ سب ایک ہی کام کرنے لگیں تو انتشار پھیل جائے، انسان سلامت ہی نہ رہ پائے۔ اس لیے احساس کمتری کا شکار ہونے کے بجائے پورے اعتماد سے ایک عورت کی ذمہ داریاں نبھاؤ۔ اگر حالات کا تقاضا ہو تو گھر سے باہر جا کر ملازمت بھی کرو، اپنے خاندان کی معاشی کفالت میں ہاتھ بٹاؤ۔ اگر اس کی ضرورت نہیں تو اپنے گھر کو سنبھالنا، اپنے اہل خانہ کا خیال رکھنا، نئی نسل کی بہتر تربیت کوئی کم اہم

کام نہیں۔اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کاموں کو اچھے سے سرانجام دینے والی عورت کو جنت کی خوش خبری سنائی۔تم جانتی ہو کہ کسی مسلمان کے لیے جنت کی خبر سے بڑی اور اچھی کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔

میری بچی، میری آنکھوں کا نور، میں تمھیں یہی کہوں گا کہ اپنے فیصلے خود لو، سوچ سمجھ کر کرو، مگر حق کے آگے جھکنے، سرنڈر کرنے میں کبھی گریز نہ کرنا۔اگر کوئی تمھیں حق کی طرف بلائے، اچھی نصیحت کرے تو اسے یہ سمجھ کر رد نہ کرنا کہ میں لوگوں کی نہیں اپنی مرضی کروں گی۔نہیں یہ فتنہ ہے۔شیطان کے پھیلائے ہوئے جالوں میں سے ایک جال۔حتمی بات صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔اپنا آئیڈیل، رول ماڈل ان کی بیٹی اور جنت میں خواتین کی سردار حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بناؤ۔اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کو بناؤ، جن کے علم نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی رہنمائی کی۔رب تعالیٰ تمہارے لیے زندگی کا سفر آسان کرے، ہر مشکل وقت پر اس کی مدد شامل رہے۔''

فرح رضوان

مٹی پاؤ کا فلسفہ

آپ کے ساتھ کسی کے برے، گھٹیا یا ناروا عمل کے بعد ردعمل کا مکمل اختیار آپ کے پاس ہوتا ہے۔آپ جوابی کارروائی کرتے وقت اس سے زیادہ بھی گراوٹ کا شکار ہو سکتے ہیں۔ برابری کا لحاظ رکھتے ہوئے اسی سطح پر بھی آ سکتے ہیں۔لیکن "اس سطح" پر آ جانا بھی تو پھر سطحی سی ہی بات ہو جاتی ہے۔اور سچی بات تو یہ ہے کہ کسی اعلیٰ انسان کے لیے اکثر ایسے کسی ردعمل کی گنجائش سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی، وہ صرف ایک ہی عمل کر سکتا ہے......وہ ہے صبر۔

کئی سال پہلے بھائی سوات گئے تو ان کے دوست کے گھر والوں نے ان کو اپنے گھر میں سُکھائے گئے مکئی کے دانوں کا تھیلا تحفے میں دیا۔امی نے ان سے پوپ کارن بنانے چاہے تو چند دانوں کے سوا باقی ویسے ہی ڈھیٹ بنے، جل تو گئے، پر کھل کر نہ دیئے، یہ عمل دو تین بار دھرانے کے بعد، ہم بچے تو ان مکئی کے دانوں سے مایوس ہو گئے۔

لیکن امی نے ان کو کچن سے متصل باغ میں بو دیا......

آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، ہم بچہ پارٹی تو بھول بھال گئے، البتہ امی اس پراجیکٹ پر کام کرتی رہیں۔باغ کا یہ ایریا کچن کی سیوریج کی پرابلم سے کافی متاثر ہونے کے سبب اچھی خاصی بو کا شکار ہو چکا تھا لیکن اس پراجیکٹ کے سبب مزید مٹی ڈالوانے پر نہ صرف بدبو سے نجات مل گئی بلکہ جس سبب سے ناگوار بو باغ کے حسن کو متاثر کر رہی تھی وہ ازخود کھاد میں تبدیل ہو گئی۔اور پھر......کچھ ہی عرصے میں اس حصے میں ہریالی پھوٹ پڑی، تو حیرت کے ساتھ ہی امید نے بھی جنم لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے باقاعدہ کئی کئی فٹ لمبی مکئی کی فصل تیار ہو گئی۔جس کے ایک ایک پودے میں کئی کئی سوانتہائی میٹھے رس دار اور رنگ دار دانے لیے خوب صحت مند قسم کے بھٹے موجود

تھے۔

ان کو دیکھ کر جو خوشی ہوئی وہ اُس وقت پوپ کارن کھا کر نہیں ہوتی۔ تب اگر پوپ کارن بن بھی جاتے تو ہم کتنے لمحے وہ لذت یا خوشی یاد رکھتے؟ اور جو خوشی اور سبق ہمیں اس پورے معاملے سے ملا وہ کیسے سیکھ پاتے؟ مکئی کے دانوں کو مٹی میں دبانے سے جو فصل نکلی، وہ کیسے دیکھ پاتے۔

مٹی پاؤ جو اکثر خاندانی تنازعات میں سیانے لوگوں کا وطیرہ ہوتا ہے اس کا مطلب شاید یہی ہوتا ہے کہ وہ لوگ، یا لوگوں کی وجہ سے وہ حالات جو آج کسی صورت ٹھیک نہیں ہو رہے، ان کو وقت کی گرد میں دبا دیا جائے۔ وقتی طور پر کوئی بات بھی امید افزا دکھائی نہیں دیتی تب بھی صبر کرنا چاہیے۔ کیونکہ مایوسی گناہ ہے اور امید پر دنیا قائم ہے۔

ہمارا رب ہمیں دن رات اپنی اس کائنات میں اپنی قدرت اور صناعی سے یہی آرٹ آف لیونگ سکھا رہا ہوتا ہے۔ دانوں کو زمین میں ڈال کر مٹی ڈال دینے کا سبق بھی یہی ہے کہ جو ذات باری نیچر میں تبدیلی کی قدرت رکھتی ہے، لوگوں کے نیچر کو بدل دینا اور نقصان کو بے گنتی فوائد میں بدل ڈالنا بھی تو اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

سوال و جواب

ابو یحییٰ

اسلام میں عزت اور شرف کا معیار اور بزرگوں کے ہاتھ چومنا

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سر مجھے یہ پوچھنا ہے کہ کیا کوئی صرف بزرگ ہستیوں کے گھر میں پیدا ہو جانے سے لوگوں کے لیے عزت و شرف کا باعث بن جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی بچہ سید گھرانے میں پیدا ہو جائے تو وہ بچہ دوسرے مسلمانوں سے کسی برتر درجے پر فائز ہوگا؟ اسی طرح اگر کوئی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خاندان سے نسبت رکھتا ہو تو کیا صرف نسبت کی بنا پر اسے دوسرے مسلمانوں پر کوئی درجہ و فضیلت حاصل ہوگی؟

اگر ہاں تو یہ برہمنیت سے کیسے مختلف ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث بیان کی جاتی ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ

"اے فاطمہ! خود کو جہنم کی آگ سے بچانا، اگر اللہ پاک نے پکڑ لیا تو میں کچھ کام نہ آ سکوں گا"

تو اس کا کیا مطلب ہوگا؟ اور اسی طرح:

"اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔"

کا کیا مطلب ہوگا؟

اور اگر نہیں تو پھر قرآن پاک میں سورۃ الاحزاب آیت 32 میں نبی کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنھن کے بارے میں جو کہا گیا ہے کہ

"لستن کاحد من النسا"

یعنی تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو،اس کا کیا مطلب ہے۔ براہِ کرم ذرا وضاحت فرما دیجیے۔

اور ازراہِ کرم اس بات کی بھی وضاحت فرما دیں کہ کسی حقیقی فضیلت کی بنا پر جیسے والدین یا عام لوگوں میں مشہور متقی لوگ مثلاً عرف عام میں پیر صاحبان وغیرہ کے ہاتھوں یا پاؤں کو عقیدت سے چومنا کیسا ہے۔

جزاك الله خيراً **عابد علی**

جواب:

ہمارے دین میں کسی شخص کو اللہ کے نزدیک کیا مقام حاصل ہے اس کا فیصلہ قرآن کریم اپنے نزول کے وقت ہی کر چکا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو'' (الحجرات 13:49)

اس بات کو مزید سمجھنا ہو تو قرآن مجید میں بیان ہونے والی بنی اسرائیل کی داستان پڑھیے۔ وہ حضرت ابراہیم اور ان کے بعد آنے والے متعدد جلیل القدر انبیا کی اولاد تھے۔مگر کیا اس سے کوئی فرق پڑا۔ ہرگز نہیں اللہ نے ان سے ان کے اعمال کے مطابق معاملہ کیا اور جب ان کے اعمال بگڑے تو ان پر لعنت کر دی گئی۔

خود حضور کو دیکھ لیجیے۔ ابولہب کا رشتہ حضور سے سگے چچا کا تھا،مگر وہ بھی اس کے کام نہ آیا۔ اس کا انجام سورہ لہب میں پڑھ لیں۔

قرآن کی طرح حدیث میں بھی کوئی ایسی بات ہرگز نہیں بیان ہوئی ہے جس سے یہ تاثر ملے کہ کسی خاندان سے نسبت انسان کو دوسروں پر شرف اور برتری دے دیتی ہے۔ کچھ احادیث آپ ہی نے نقل کر دی ہیں،ان کے علاوہ خطبہ حجۃ الوداع سے متعلق ایک روایت میں اس بات

کواس طرح بیان کیا گیا ہے کہ کسی عربی کو عجمی اور کسی عجمی کو عربی پر، اسی طرح کسی گورے کو کالے پر کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

رہی سورہ احزاب کی آیت کی بات تو یہ فضیلت کا نہیں ذمہ داری کا معاملہ تھا۔ یعنی حضور کی ازواج کا معاملہ اوران کی ذات کی حساسیت عام خواتین کی طرح نہ تھی۔ بلکہ ان کے حوالے سے کوئی الزام لگایا جاتا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر لگایا گیا تھا تو اس سے خود حضور کی ذات اور شخصیت کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ اس لیے ان کو کچھ خصوصی احکام دیے گئے تا کہ منافقین کو کسی طرح کی فتنہ انگیزی کا ذریعہ نہ مل سکے۔ آپ کا نقل کردہ جملہ اسی پس منظر کا ہے۔ قرآن مجید کے سیاق وسباق سے بالکل واضح ہے کہ یہ کسی خاندانی فضیلت کا بیان نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے منصب کی بنا پر عام لوگوں کی طرح نہیں ہیں، اسی طرح ان کی ازواج بحیثیت اہل خانہ عام لوگوں کی طرح نہیں بلکہ ان پر لگی ہوئی کسی بھی تہمت سے آپ کا متاثر ہونا لازمی ہے۔

باقی ہاتھ پاؤں چومنے کا جو معاملہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ اظہار عقیدت کا ایک ذریعہ ہے۔ انسان محبت میں اپنے فطری جذبات کے اظہار کے لیے ماں یا باپ کے ہاتھ چوم لیتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر مذہبی لوگوں سے اس طرح کی عقیدت اکثر خرابی کا سبب بنتی ہے۔ اس سے بچنا بہتر ہے۔

والسلام علیکم

ابو یحییٰ

کیا محض اندیشہ کی بنا پر قتل ناحق جائز ہے؟

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نے سورہ کہف پر آپ کا آرٹیکل پڑھا۔ بہت اچھا اور متاثر کن تھا۔ لیکن میرا ایک سوال ہے جو میں کافی دیر سے پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن کبھی موقع نہ مل سکا اس لیے آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ سورہ کہف میں بیان کردہ واقعہ کے مطابق جب حضرت خضر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان باتوں کی وضاحت کر رہے تھے تو کشتی کو عیب زدہ کرنے اور گرتی ہوئی دیوار کو (بلا معاوضہ) سیدھا کر دینے کی بنیاد حقائق پر مبنی تھی۔ لیکن جب انہوں نے ایک چھوٹے بچے کو جان سے مار ڈالا تو یہ انہوں نے ''محض خوف'' کے تحت کیا نہ کہ کسی حقیقی واقع کے تحت۔ جب ہم کسی چیز سے ڈرتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ ہو جائے لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ وقوع پذیر ہی نہ ہو۔ خدا کا کوئی باغی بھی کسی بھی وقت توبہ کر کے خدا کی طرف لوٹ سکتا ہے اور ایک اچھا انسان اور خدا کا فرمانبردار بندہ بن سکتا ہے۔ یقینی طور پر اس مخصوص واقع میں ہم جانتے ہیں کہ حضرت خضر کو یہ حکم خدا کی طرف سے ہی دیا گیا تھا۔ لیکن جب بھی میں ان آیات پر پہنچتی ہوں تو یہ سوال میرے ذہن میں پھر پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے وجدان (intuition) پر کس حد تک اعتبار کر سکتے ہیں؟ اور مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ حضرت خضر کے اس عمل کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی حقیقت کارفرما تھی جو کہ ان آیات میں کہیں مخفی ہے اور میری ابھی اس تک رسائی نہیں ہوئی۔

جزاک اللہ خیر

زوہا فاروقی

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دیکھیے اس معاملہ میں ہمیں دو چیزیں ذہن میں رکھنی چاہئیں۔

۱۔ خضر ایک فرشتہ تھے اور انھوں نے جو بھی کیا اللہ تعالیٰ سے حکم ملنے کے بعد ہی کیا۔لہٰذا ہم اپنے میں سے کسی کا بھی ان کے ساتھ موازنہ نہیں کر سکتے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ یہاں استعمال ہونے والے الفاظ مثلاً "خشینا" اللہ تعالیٰ کی طرف سے استعمال کیے گئے ہیں۔ان کا مطلب "ممکن ہے" یا "شاید" کے نہیں ہے بلکہ یہ "یقینی امور" پر دلالت کرتے ہیں۔جیسا کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ "عسٰی" کا لفظ استعمال فرماتے ہیں۔اس کا لغوی معنی ہے کہ "شائد" لیکن جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ اپنے لیے استعمال فرماتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یقیناً ایسا کریں گے۔اصل میں یہ بادشاہوں کے کلام کرنے کا شاہانہ انداز ہے۔اور اللہ تعالیٰ سب سے عظیم ہستی ہیں تو وہ ایسے انداز میں کلام فرماتے ہیں۔

اس بات کو یاد رکھیے کہ یہاں پر خضر اللہ تعالیٰ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔امید ہے کہ اس سے بات واضح ہوگئی ہوگی۔

جزاک اللہ خیر

ابویحییٰ

زندگی میں پیش آنے والے ناگوار حالات
روزے دار کے ایک سخت دن کی طرح
آخر کار گزر جاتے ہیں (ابویحییٰ)

ابو یحییٰ
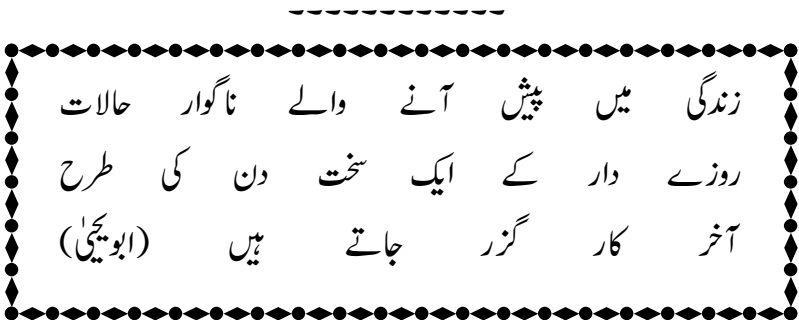
مضامین قرآن (34)

دین کی بنیادی دعوت: صفات باری تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا تعارف کرانا قرآن مجید کے مقاصد نزول میں سے ایک بنیادی مقصد ہے۔ یہ تعارف سب سے بڑھ کر جس پہلو سے قرآن مجید میں کرایا گیا ہے وہ صفات باری تعالیٰ کے حوالے سے ہے۔ ذات باری تعالیٰ جیسا کہ پیچھے گزرا، انسانوں سے اس طرح مختلف اور منفرد ہے کہ ان کا فہم وادراک اس کی ہستی کا احاطہ تو کیا ابتدائی تصور کرنے سے بھی عاجز ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں قرآن مجید کا زیادہ زور ان غلط تصورات کی اصلاح پر ہے جو انسانوں نے اس کے حوالے سے قائم کر لیے تھے۔ لیکن مثبت طور پر قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کا تعارف اس کی صفات کے پہلو سے کرایا ہے۔ ان صفات کو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ دو طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔ ایک بطور اسماء الحسنٰی جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو اچھے ناموں سے بیان کیا جاتا ہے۔ دوسرے طریقے میں اسماء کے بجائے بیان وصف کے طریقے پر اللہ تعالیٰ اپنی صفات کو بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں کہیں اللہ تعالیٰ کو الخالق کہہ دیا گیا ہے۔ یہ پہلے طریقے کی مثال ہے۔ کہیں پر کہا گیا ہے کہ خلق الانسان یعنی اس نے انسان کو پیدا کیا یا خالق کل شی یعنی وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔

اللہ کا نام

اللہ تعالیٰ کی ہستی انسانوں کے لیے کبھی اجنبی نہیں رہی۔ انسان اپنے آغاز ہی سے وجود باری تعالیٰ سے واقف تھا۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے وجود باری تعالیٰ کے دلائل میں اس چیز کو بیان کیا

کہ انسان اس دنیا میں خدا سے براہ راست متعارف ہوکر آیا تھا۔ تاہم اس دنیا میں حالت امتحان میں ہونے کی بنا پر اس کے اور رب العالمین کے درمیان میں غیب کا ایک پردہ حائل ہوگیا تھا۔ اس پردے کے پیچھے رہ کر خدا کو پکارنے، اس سے مانگنے اور فریاد کرنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ اسے نام لے کر پکارا جائے۔ دوسری طرف نام کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ کسی ہستی کو اس جیسی کسی دوسری ہستی سے ممتاز کر کے الگ سے شناخت کرنے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی دوسرا ہے ہی نہیں، چنانچہ اس پہلو سے اس کو کسی نام کی ضرورت نہیں نہ اس کا کوئی نام ہے۔

اس گفتگو سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ کا نام اس کی نہیں مخلوق کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو یہ بات بتادی کہ سارے اچھے نام اسی کے ہیں۔ تم جس اچھے نام سے جو اس کی ذات کو زیبا ہو، پکارلو۔ ان میں سے سب سے پہلا اور معروف نام اللہ کا ہے۔ یہ عربی زبان میں اسی معنوں میں استعمال ہوتا تھا جن معنوں میں مثال کے طور پر انگریزی میں God، فارسی میں خدا، سنسکرت میں ایشور بولا جاتا ہے۔ یہ اسم عربی زبان میں نزول قرآن سے پہلے بھی استعمال ہوتا تھا۔ اہل عرب اس اسم کو اس خالق و مالک کے لیے استعمال کرتے تھے جس کے ہاتھ میں رزق، زندگی، موت اور تمام امور کائنات ہیں۔ یہ لفظ 'الٰہ' یعنی معبود پر الف لام تعریف داخل کر کے بنایا گیا اور کثرت استعمال سے 'الالٰہ' سے اللہ رہ گیا۔

قرآن مجید نے کفار مکہ کا ایک اعتراض نقل کر کے یہ بات واضح کی ہے اللہ تعالیٰ کے لیے اللہ کے علاوہ بھی کوئی اور اچھا نام جیسے الرحمٰن جو کہ مسیحی اہل عرب میں مستعمل تھا، بلا تکلف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی بھی صفاتی نام کے لیے اس کا اچھا ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایسی بہت سی صفات قرآن مجید میں جگہ جگہ خود بیان کردی ہیں۔ تاہم یاد رہے کہ بہت سی صفات اپنے موقع محل سے مجرد ہوکر مستقل

صفات کے مفہوم میں انسانوں کے ہاں اچھی نہیں سمجھی جاتیں۔ مثلاً جو لوگ اپنے جرائم کی بنا پر بطور سزا ذلت کے مستحق ہوں، ان پر ایک حاکم یا قاضی کوئی ایسی سزا نافذ کر سکتا جس میں ان کی ذلت کا پہلو نمایاں ہو جائے لیکن اس بنا پر قاضی کو ذلیل کرنے والا کہنا، انسانوں میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہی معاملہ مثال کے طور پر نقصان پہنچانے، انتقام لینے وغیرہ کا ہے۔ یہ کسی موقع پر کیا جانے والا عمل تو ہو سکتا ہے جو بر بنائے عدل کیا جائے گا تو قابل تحسین ہوگا اور اسی حیثیت میں بیان بھی ہو جائے گا، لیکن بطور اسم اسے بیان کرنا کوئی درست عمل نہیں۔

چنانچہ یہی پس منظر ہے جس میں ایسے بعض افعال قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بیان کیے گئے ہیں جو اپنے موقع پر باعث تحسین ہیں، لیکن بطور اسم نہ قرآن مجید نے ان کو بیان کیا ہے نہ ان کا بیان کیا جانا کسی پہلو سے بھی انسانوں میں باعث تحسین سمجھا جاتا ہے۔

صفات باری تعالیٰ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان کے تین بنیادی مقاصد ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کے متعلق لوگوں کو درست تصور دیا جائے اور غلط تصورات کی اصلاح کی جائے۔ دوسرا یہ کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ خدا ان سے غیر متعلق کوئی وجود نہیں بلکہ ہر لمحہ اور ہر لحظہ وہ خدا کی عنایات اور اس کے کرم کی وجہ سے زندگی گزار رہے ہیں۔ تیسرا یہ کہ لوگ متنبہ رہیں کہ جس خدا نے یہ سب کچھ عطا کیا ہے، اس کے حضور سرکشی، نافرمانی غفلت و معصیت میں مبتلا رہنے والے یاد رکھیں کہ وہ کسی طور اس کی پکڑ اور گرفت سے باہر نہیں ہیں۔ یہ تینوں پہلو بالترتیب خدا کے کمال، جمال اور جلال کا بیان ہے۔ ان تین طرح کی صفات کو ہم تفہیم مدعا کے لیے صفات احدیت یا صفات کمال، صفات رحمت یا صفات جمال اور صفات قدرت یا صفات جلال کے عنوان سے ذیل میں بیان کر رہے ہیں۔

صفات احدیت یا صفات کمال

صفات احدیت یا صفات کمال اصلاً اللہ تعالیٰ کی ہستی کا بیان ہیں۔ یہ اس کے ہونے اور مخلوق سے جدا بطور ایک مشخص ہستی کے موجود ہونے کا بیان ہیں۔ یہ صفات اللہ تعالیٰ کی ذات کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتی ہیں جس طرح کہ وہ مخلوقات سے جدا بطور ان کے رب، خالق، مالک اور معبود کے طور پر موجود ہے، ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ صفات اس بات کا جواب دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کیا ہیں۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں مثال کے طور پر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ احد ہیں۔ وہ الہ ہیں۔ وہ غنی ہیں۔ وہ حمید ہیں۔ وہ اول ہیں۔ وہ آخر ہیں۔ وہ ظاہر ہیں۔ وہ باطن ہیں۔ یہ صفات اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا اور اپنی ہستی میں ہر عیب، ہر عجز، ہر کمزوری، ہر ناتمامی اور ہر نقص سے پاک ہے۔ چنانچہ اسی پس منظر میں پوری کائنات اس کی تسبیح کرتی ہے۔ تسبیح اسی چیز کا بیان ہے کہ خدا کی ذات ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے۔ یہ پاکی اس کی ذات کے پہلو سے بھی ہے، خصوصیات کے پہلو سے بھی اور افعال کے پہلو سے بھی۔ چنانچہ یہی تسبیح زمین و آسمان کی ہر شے کا وظیفہ ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ ان صفات کے بیان کا اصل مقصد اللہ کے بارے میں غلط تصورات کی تصحیح تھی۔ نیز ہر مشرکانہ تصور کے خاتمے کے ساتھ صرف ایک اللہ کی عبادت پر متوجہ کرنا تھا۔

صفات رحمت یا صفات جمال

صفات رحمت یا صفات جمال اللہ تعالیٰ کی ہستی کے اس پہلو کا تعارف ہیں جس میں اس کی ذات کامل اپنے ذوق رحمت کا اظہار کرتی اور مخلوق کو وجود بخش کر اس پر اپنے کمال عطا کی بارش کرتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ پس منظر ہے جس میں اللہ تعالیٰ موجودات کو پیدا کرتے ہیں۔ ان کو

زندگی اور رزق دیتے ہیں۔ ان کی نگہبانی کرتے ہیں۔ ان کو تحفظ دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ وہ صرف اس بنا پر کرتے ہیں کہ وہ الرحمٰن ہیں۔ الرحیم ہیں۔ الرؤف ہیں۔ الکریم ہیں۔ السلام ہیں۔ الودود ہیں۔

ان صفات کے بیان کا مقصد انسانوں کو یہ بتانا ہے کہ ان کا واسطہ ایک بے حد کریم ہستی سے پڑا ہے۔ جو محبت کرنے والا ہے۔ بہت نبھانے والا ہے۔ بہت بخشش کرنے والا ہے۔ بہت معاف کرنے والا، بہت تحمل والا اور بہت چشم پوشی کرنے والا ہے۔ انسانوں نے اس دنیا میں جو کچھ پایا ہے اور ہر لمحہ پا رہے ہیں، وہ اسی رب کریم کی مہربانی سے پایا ہے۔ اور مستقبل میں بھی وہ جو کچھ پائیں گے، اسی کی عطا سے پائیں گے۔ اس کے خزانے لامحدو ہیں اور وہ ان خزانوں کو ہم انسانوں کو ابدی طور پر دینے کے لیے تیار ہے۔ ایسے رب سے محبت پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے۔ دل و دماغ کا اس کی مہربانیوں کے احساس سے سرشار ہونا عین انسانیت ہے۔ اس کی بندگی بلا جبر اور شوق سے کرنا عین تقاضائے فطرت ہے۔ انسان اگر انسان ہے تو ایسے رب کو نظر انداز کر کے نہیں جی سکتا۔

صفات قدرت یا صفات جلال

صفات قدرت یا صفات جلال اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور ہے۔ یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ جس مخلوق کو انھوں نے بنایا ہے، وہ کسی پہلو سے ان کے قبضہ قدرت، علم اور طاقت، بادشاہی اور جبروت سے باہر نہیں نکل سکتی۔ مخلوق کی تمام تر ہستی اور ارادے کے باوجود وہی قادر مطلق ہیں۔ ان کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ انھیں کی بادشاہی اور اقتدار زمین و آسمان پر قائم ہے۔ کوئی چاہے نہ چاہے اس کی اطاعت پر مجبور ہے۔ کوئی اگر سرکش ہوتا ہے اور نافرمانی سے باز نہیں آتا تو پھر وہ اس کو پکڑنے، اس کا مکمل محاسبہ کرنے اور اسے اس کے کیے کی بھرپور سزا دینے کی

مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ یہ دنیا ان کی دنیا ہے۔ یہ بادشاہی ان کی بادشاہی ہے۔کوئی فرعون ہو یا نمرود، انسان ہو یا شیطان، ظالم ہو یا فاسق ان کے اقتدار سے باہر نہیں نکل سکتا۔

یہ صفات بیان کرنے کا مقصد امتحان کی عارضی مدت میں اختیار رکھنے والے انسانوں کو یہ بتانا ہے کہ وہ کسی صورت اللہ رب العالمین کے قبضہ قدرت سے باہر نہیں نکل سکتے۔ وہ اس کے عدل کی زنجیر تڑا کر نہیں بھاگ سکتے ہیں۔ان کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کے علم میں ہے۔ وہ زندہ ہوں تب بھی اور مر جائیں تب بھی خدا کی پہنچ میں رہتے ہیں۔ وہ دنیا میں ان کا ٹھکانہ جانتا اور موت کے بعد ان کے رہنے کی جگہ سے بھی واقف ہے۔ وہ ان کی ایک ایک پور کو دوبارہ تخلیق کر کے انھیں زندہ کرنے اور اپنے سامنے حساب و کتاب کے لیے پیش کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔اس لیے اس سے بے خوف ہو کر جینا ایک تباہ کن راستہ ہے۔اس کی نافرمانی کرنا بربادی کی راہ ہے۔اس سے سرکش ہونا اس کی کبریائی تلے کچلے جانے کے مترادف ہے۔انسان اگر انسان ہے تو پھر ایسے رب کو نظر انداز کر کے جی نہیں سکتا۔

قرآنی بیانات

”ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ یا کون ہے جو سمع اور بصر پر اختیار رکھتا ہے اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون ہے جو ساری کائنات کا انتظام فرماتا ہے، تو جواب دیں گے اللہ۔ تو ان سے کہو کہ کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں؟“، (یونس 31:10)

”یہ حم ہے۔اس کتاب کی تنزیل خدائے عزیز و علیم کی طرف سے ہے، جو گناہوں کو بخشنے والا۔ توبہ کو قبول کرنے والا، سخت پاداش اور بڑی قدرت والا ہے۔اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔اسی کی طرف لوٹنا ہے۔“ (المومن 40:3-1)

”خدائے رحمان نے قرآن کی تعلیم دی۔اس نے انسان کو پیدا کیا۔“ (الرحمٰن 55:3-1)

”اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔اسی کی بادشاہی

ہے اور وہی سزاوارِ شکر ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا تو کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مومن۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اللہ کی نظر میں ہے۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اور اس نے تمہاری صورت گری کی تو اس نے تمہاری صورتیں اچھی بنائیں اور اسی کی طرف لوٹنا ہوگا۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو۔ اور اللہ باخبر ہے سینوں کے بھیدوں سے بھی۔'' (تغابن 64:4-1)

''بے شک تیرے رب کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے۔ وہی آغاز کرتا ہے اور وہی لوٹائے گا۔ اور وہ بخشنے والا پیار کرنے والا ہے۔ عرش بریں کا مالک۔ جو چاہے کر ڈالنے والا۔''

(بروج 85:16-12)

''کہہ دو کہ اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔'' (بنی اسرائیل 17 :110)

''اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں ساری چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب وحکیم ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ وہی زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی اور باطن بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دنوں میں پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ وہ جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ سب دیکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام امور کا مرجع اللہ ہی ہے۔ وہی داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور وہ سینوں کے بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔'' (الحدید 57:6-1)

''اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تمام اچھی صفتیں اسی کے لیے ہیں۔''

(طٰہٰ 20 :8)

''شکر کا سزاوارِ حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب، رحمان اور رحیم، جزا و سزا کے دن کا مالک۔''

(الفاتحہ 1:3-1)

''اور اللہ کے لیے تو صرف اچھی ہی صفتیں ہیں تو انہی سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ و جو اس کی صفات کے باب میں کج روی اختیار کر رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، عنقریب اس کا بدلہ پائیں گے۔'' (اعراف 7 :180)

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب و حاضر کا جاننے والا، وہ رحمان و رحیم ہے۔

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہ، یکسر پاک، سراپا سُکھ، امن بخش، معتمد، غالب، زور آور، صاحبِ کبریاء۔ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری کرنے والا۔ اسی کے لیے ساری اچھی صفتیں ہیں۔ اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور وہ غالب و حکیم ہے۔'' (حشر 59 :24-22)

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (38)

دریائے چوروح

اگر ہم سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تو جارجیا میں داخل ہو جاتے مگر ہو پا سے ہمیں بلیک سی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم نے اس سمندر کا آخری نظارہ کیا اور گاڑی سمندر سے ہٹ کر اندر کی طرف ڈال لی۔ یہ علاقہ بھی باقی بلیک سی ریجن کی طرح سرسبز پہاڑوں پر مشتمل تھا۔

اب ہم ایک چھوٹے سے دریا کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے جسے نالہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ یہاں کی سڑک میں بل بہت زیادہ تھے جس کی وجہ سے گاڑی کو زیادہ اسپیڈ پر بھگانا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک مقام پر قدیم دور کا پتھر کا ایک محرابی پل بنا ہوا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ''بورچکا'' جا پہنچے۔ یہاں کچھ ایسا ہی منظر تھا جیسا کہ ہمارے ہاں تھا کوٹ کے قریب شاہراہ قراقرم کا منظر ہوتا ہے جب یہ سڑک دریائے سندھ پر آ نکلتی ہے۔ بس فرق یہ تھا کہ ہم دریائے سندھ کی بجائے دریائے چوروح پر پہنچ رہے تھے۔

دریائے چوروح ترکی کے بڑے دریاؤں میں سے ایک ہے۔ یہ دریا ترکی کے شمال مشرقی ریجن کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور اپنے ساتھ بہت سے چھوٹے دریاؤں کو ملاتا ہوا جارجیا میں داخل ہوتا ہے جہاں کچھ سفر طے کرنے کے بعد یہ بلیک سی میں جا گرتا ہے۔ بورچکا پر ایک بڑا ڈیم بنا ہوا تھا جس کی جھیل کئی کلومیٹر تک پھیلی ہوئی تھی۔ ڈیم سے پہلے ہم نے دریا کا پل پار کیا اور دوسری جانب پہنچ گئے۔ اب سڑک بل کھاتی ہوئی اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ہم پہاڑ کے اوپر جا پہنچے۔ یہاں سے جھیل کا نظارہ قابل دید تھا۔

اب ہماری منزل ''آرٹوِن'' تھی جو یہاں سے محض 25 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ڈیم کی وجہ سے دریا جھیل کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ جھیل آرٹون تک ہمارے ہمراہ رہی۔ آرٹون کے بارے میں بروشرز میں بڑے بلنگ و بانگ دعوے کیے گئے تھے۔ اس وجہ سے ہمارے ذہن میں یوزن جھیل جیسا تصور موجود تھا مگر جیسے ہی ہم یہاں پہنچے، ہمارے خوابوں کا تاج محل چکنا چور ہو گیا۔ یہ خشک پتھریلے پہاڑوں کے درمیان واقع ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس میں کہیں کہیں سبزہ نظر آ رہا تھا۔ دریائے چوروح کا رنگ بھی مٹیالا تھا جس کی وجہ سے اس کا حسن بھی ماند پڑ گیا تھا۔

شہر کے بیچ میں ایک نہایت ہی شاندار آبشار موجود تھی جس میں سے بے پناہ پانی نیچے گر رہا تھا۔ میری اہلیہ کہنے لگیں، ''یہ آبشار قدرتی نہیں لگ رہی۔'' میرا خیال تھا کہ یہ قدرتی ہے۔ ہم کچھ دیر آبشار کے نیچے بیٹھ کر اس کا نظارہ کرنے لگے۔ ہمارے اختلاف کا تھوڑی دیر ہی میں فیصلہ اس طرح ہوا کہ اچانک بجلی چلی گئی اور یہ قدرتی نظر آنے والی آبشار خود بخود بند ہو گئی۔ یہاں ایک دکان سے ہم نے کھانے پینے کی کچھ اشیاء خریدیں۔ میں نے اپنے لئے پھل لیا جس میں ترکی کی مشہور زمانہ خوبانیاں شامل تھیں۔ یہ سائز میں ہماری خوبانیوں سے دوگنا اور نہایت ہی رسیلی تھیں۔

دکاندار نے مجھے ایرانی سمجھ کر خواہ مخواہ فارسی میں منہ ماری کرنا چاہی۔ جب میں نے اپنا تعارف کروایا تو وہ صاحب بڑے افسردہ ہوئے۔ کہنے لگے، ''پاکستان کے حالات بہت خراب ہیں۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا میڈیا بھی پاکستان کے حالات کو خاصی کوریج دیتا ہے کہ ایک دور دراز دیہاتی علاقے میں رہنے والوں کو بھی پاکستان کے حالات کا علم ہے۔

احمد بشیر طاہر

ہوا ہے فیصلہ بستی جلائی جائے گی
پھر اس کے بعد شب غم منائی جائے گی

امیر شہر کو رونا ہے جس قیامت پر
کسی غریب کے گھر میں اٹھائی جائے گی

مجھے صفائی کا موقع بھلے ملے نہ ملے
سنا ہے عام عدالت لگائی جائے گی

بلا کے سامنے کر کے کھڑا کٹہرے میں
میرے خلاف کہانی بنائی جائے گی

یہ داستانِ وفا ہے یہاں نہیں طاہؔر
بروز حشر سنی اور سنائی جائے گی

پروین سلطانہ حناؔ

غزل

کرتی رہی سوال میں، دیتا رہا جواب وہ
آیا جو فیصلے کا دن، ہو گیا لاجواب وہ

اس کا خطاب پُر یقین، اور لفظ دِل نشیں
دیکھئے غور سے اسے لگتا ہے اک کتاب وہ

وسعتیں اس کی بے کراں، محدود ہوں میں ناتواں
عرش سے لے کے فرش تک بے حد و بے حساب وہ

نظروں کی جستجو نے تو ڈھونڈا اُسے ہر اِک جگہ
خوشبو ہے، پھول ہے کہیں، دلکش سا ماہتاب وہ

ہر شے میں جلوہ گر سہی، پھر بھی ہے وہ حجاب میں
دیکھا جو غور سے اُسے ہر سمت بے نقاب وہ

ذکر سے اُس کے سج گئیں ارض و سماں کی محفلیں
جتنے بھی بادہ خوار تھے، پینے لگے شراب وہ

خواب تھا جب تلک رہا میری نظر سے دور وہ
آیا قریب تو ہوا، اور بھی بے نقاب وہ

آب و ہوا سے رہ کے دور خاک نشیں تھیں خوشبوئیں
پا کے ہَوا کا لمس بھی، کھلنے لگا گلاب وہ

دلبر ہے، دل نشین ہے، اس پر مجھے یقین ہے
میں اس کا انتخاب ہوں اور میرا انتخاب وہ

رنگِ حنا ہے آج بھی پہلے سے بڑھ کے معتبر
جب سے مرے لئے ہوا، موضوعِ انتخاب وہ

ابو یحییٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابو یحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابو یحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

Please visit this link to read all articles and books of Abu Yahya free online.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)